پیغام سیرت!

# اسلامی نظام حکومت کے بنیادی خدوخال

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم ۔ اما بعد

اللہ تعالیٰ تمام موجودات کا خالق و مالک ہے۔ آسمان و زمین، سورج و چاند، ستارے اور کروڑوں ستاروں سے مزین کہکشاں، لیل ونہار، جبال و بحار، احجار واشجار، نباتات و جمادات، حشرات، وحیوانات، چرند و پرند، اور جن وانسان، سب کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے۔

هُوَالَّذِیْ خَلَقَ لَکُمْ مَّافِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ثُمَّ اسْتَوٰٓی اِلَی السَّمَآءِ فَسَوّٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ط (۱)

وہ (پاک ذات) وہی ہے جس نے تمہارے (فائدے کے) لئے وہ سب کا سب جو کچھ زمین میں ہے، پیدا کیا۔ پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا سو ان کو ٹھیک (اور درست کر کے) سات آسمان بنا دیا۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بندوں کو اپنا ایک انعام یاد دلایا ہے کہ تم اس خدا سے کیسے روگردانی کر سکتے ہو جس نے زمین کی ہر چیز کو تمہارے فائدے کے لئے پیدا کیا۔ دنیا کی کوئی چیز ایسی نہیں جس سے انسان کسی نہ کسی شکل میں بالواسطہ یا بلاواسطہ فائدہ نہ اٹھاتا ہو۔ بہت سی چیزوں کا فائدہ تو انسان محسوس کرتا ہے جیسے اس کی غذا، لباس اور مکان وغیرہ۔ یہ سب زمین ہی کی پیداوار ہیں۔ کچھ چیزیں ایسی بھی ہیں جن سے انسان کو فائدہ تو پہنچتا ہے مگر اس کو ان کی خبر نہیں ہوتی یہاں تک کہ بعض زہریلی اشیا اور زہریلے کیڑے وغیرہ بھی انسان کے لئے کسی نہ کسی حیثیت میں نفع بخش ہوتے ہیں۔ (۲)

---

(۱) البقرہ آیت ۲۹۔ (۲) سید فضل الرحمٰن/ احسن البیان/ زوار اکیڈمی پبلی کیشنز، کراچی ۲۰۰۴ء/ ج/ ص ۱۵۸

اللہ تعالیٰ واحد و احد و صمد ہے۔ اس کے نہ کوئی لڑکا ہے، نہ کوئی باپ، نہ کوئی بیوی ہے اور نہ اس کا کوئی عدیل و نظیر، نہ وہ ایسا حقیر کہ کسی کی حمایت کا محتاج ہو یا اسے کسی وزیر یا مشیر کی حاجت ہو۔ پس جو ذات ایسی کامل و مکمل اور عظمت و حکمت والی ہو، اور وہی اللہ ہے اور وہی پروردگار ہے اور وہی عبادت کے لائق ہے۔

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ خَالِقُ كُلِّ شَیْءٍ فَاعْبُدُوْهُ (۱)

وہی اللہ تمہارے رب ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہی ہر چیز کا خالق ہے سو تم اسی کی عبادت کرو۔

## مقتدرِ اعلیٰ:

اللہ تعالیٰ ہی سب کا حاکم ہے۔ اسی کا حکم تمام کائنات میں جاری ہے، مخلوق میں سے کوئی اس کے حکم سے باہر نہیں۔ وہ قادر مطلق اور خالق و مالک اور سب کا رازق ہے۔ اس لئے وہ جو چاہے، جیسا چاہے اور جب چاہے کرے۔ کسی کو اس کے ارادے اور مشیت میں دخل نہیں۔ اسی لئے اسلام نے اجتماعی نظام حکومت اور اساسی قوانین کا وضع کرنا کسی انسان کے ہاتھ میں نہیں دیا بلکہ اس نے واضح طور پر بتا دیا کہ یہ کام خدائے واحد کا ہے۔ وہی حقیقی مقنن ہے اور اسی کی ذات مقتدر اعلیٰ ہے، وہی آمر اور حاکم حقیقی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

وَهُوَ الَّذِیْ فِی السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِی الْاَرْضِ اِلٰهٌ (۲)

اور وہی ہے جو آسمان میں اللہ ہے اور وہی زمین میں بھی اللہ ہے۔

اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ط (۳)

آگاہ ہو جاؤ! پیدا کرنا اور حکم دینا اسی کا کام ہے۔

پس خالق و حاکم ہونا اللہ تعالیٰ ہی کے لئے خاص ہے۔ اس کے سوا نہ کوئی دوسرا کسی ادنیٰ چیز کو پیدا کر سکتا ہے اور نہ کسی کو کسی پر حکم کرنے کا حق ہے، سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے حکم کا کوئی شعبہ کسی کے سپرد کر دیا جائے۔ حقیقت کے اعتبار سے وہ بھی اللہ تعالیٰ ہی کا حکم ہے۔

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ يَقُصُّ الْحَقَّ وَهُوَ خَيْرُ الْفٰصِلِيْنَ ط (۴)

بیشک اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کا حکم نہیں۔ وہی حق بیان فرماتا ہے اور وہی سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔

(۱) الانعام آیت ۱۰۲۔ (۲) زخرف آیت ۸۴۔ (۳) الاعراف آیت ۵۴۔ (۴) الانعام آیت ۵۷۔

وَلَا یُشْرِکُ فِیْ حُکْمِہٖ اَحَداً (۱)

اور نہ وہ (اللہ) کسی کو اپنے حکم میں شریک کرتا ہے۔

جن لوگوں کو دنیا میں حکومت و اقتدار عطا کیا جاتا ہے وہ تکوینی اور تشریعی دونوں قسم کے احکام الٰہی کے تابع ہوتے ہیں اور مملکت میں بھی شریعت الٰہی کے مطابق احکام جاری کرنے کے پابند ہیں۔ بعض لوگ شرعی احکام میں عقلی مصلحتوں اور طبعی نفع و ضرر کے متلاشی رہتے ہیں مگر شریعت میں احکام کا مدار صرف عقلی مصلحتوں اور طبعی نفع و ضرر پر نہیں بلکہ اصل مدار اس پر ہے کہ کس کام سے اللہ تعالیٰ راضی ہوتا ہے اور کس سے ناراض، چنانچہ اہل عقل و دانش اپنی ناقص فہم سے جو کچھ کہتے ہیں اگر وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق نہیں تو گو اس میں ظاہری طور پر کتنی ہی مصلحتیں اور منافع ہوں مگر وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں نا مقبول و نا منظور ہیں (۲)

چنانچہ اسلامی ریاست کا سربراہ اس بات کا پابند ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے تفویض کردہ اختیارات سے تجاوز نہ کرے اور ریاست میں اپنی مرضی کے قوانین کے اجرا و نفاذ سے کامل اجتناب کرے۔ اگر کسی نے اپنی طرف سے کوئی قانون وضع کیا اور اللہ تعالیٰ کی سند کے بغیر کسی چیز کو حلال یا حرام ٹھہرایا تو یہ اللہ تعالیٰ پر افترا باندھنے کے مترادف ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُکُمُ الْکَذِبَ ھٰذَا حَلٰلٌ وَّ ھٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَی اللّٰہِ الْکَذِبَ ط اِنَّ الَّذِیْنَ یَفْتَرُوْنَ عَلَی اللّٰہِ الْکَذِبَ لَا یُفْلِحُوْنَ o مَتَاعٌ قَلِیْلٌ وَّلَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ o (۳)

اور اپنی زبانوں سے جھوٹ بنا کر نہ کہو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے کیونکہ یہ اللہ پر جھوٹی تہمت لگانا ہے۔ بلاشبہ جو لوگ اللہ تعالیٰ پر جھوٹی تہمت لگاتے ہیں وہ فلاح نہیں پائیں گے۔ یہ تھوڑا سا (دنیاوی) فائدہ ہے (سو وہ حاصل کرلیں) اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم شریعتِ الٰہی کے مظہر تھے اور بندوں کو اللہ تعالیٰ کے احکام سے آگاہ فرماتے تھے۔ اپنی طرف سے نہ تو احکام وضع فرماتے تھے اور نہ ان کی اختراع فرماتے تھے۔ ارشاد باری ہے۔

وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی o اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی o (۴)

---

(۱) الکہف آیت ۲۶ (۲) سید فضل الرحمٰن/ ہادیِ اعظم طبع اول/ ادارہ مجددیہ کراچی، ۱۹۹۱ء/ ص، ۷۷-۷۶ (۳) النحل آیات ۱۱۶، ۱۱۷ (۴) النجم آیات ۳، ۴

اور وہ اپنی خواہش سے کچھ نہیں کہتے بلکہ وہ وہی کہتے ہیں جو ان کی طرف وحی کیا جاتا ہے۔

جہاں تک انبیا، خلفا اور امرا کی اطاعت کا تعلق ہے تو وہ احکامِ الٰہی کے نفاذ کی حد تک ہے، جیسا کہ ارشاد ہے۔

وَمَا اَرْسَلْنَا مِن رَّسُوْلٍ اِلَّالِيُطَعَ بِاِذْنِ اللّٰه. (۱)

اور ہم نے کسی رسول کو نہیں بھیجا مگر اس لئے کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے

مَن يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰه. (۲)

جس نے رسول کی اطاعت کی تو گویا اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

احکام جاری کرنے اور قوانین وضع کرنے کا حق تو صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہے البتہ اس نے اپنی شریعت میں جو کلیے اور قاعدے بیان فرما دیئے ہیں، علمائے کرام اور مجتہدین عظام ان کی روشنی میں غور و فکر کر کے نئی جزئیات مستنبط کر سکتے ہیں۔ ہر شخص مجتہد نہیں ہو سکتا۔ مجتہد وہ ہے جو احکام الٰہی کے اصول و فروع پر پوری نظر رکھتا ہو۔ قرآن و حدیث سے احکام کے تمام اصول اور ان کے اسباب و علل اور مصالح و مقاصد کو جانتا ہو، تا کہ ان کی روشنی میں پیش آنے والی جزئی صورتوں کا فیصلہ کر سکے۔ اس لحاظ سے مجتہد کا اجتہاد و قیاس نہ تو کسی نئے حکم کو وضع کرتا ہے اور نہ اس کی اختراع کرتا ہے بلکہ وہ نئی پیش آنے والی صورتوں اور حالات کے پیش نظر اپنے اجتہاد سے اپنے حکم میں صرف یہ ظاہر کرتا ہے کہ مقررہ احکام الٰہی کے تحت اس نئی صورت کا کیا جواب ہے۔ (۳)

## خلافتِ انسانی

اللہ تعالیٰ اس کائنات کا خالق و مالک اور حاکم اعلیٰ ہے اور انسان کی حیثیت اس کے نمائندے اور خلیفہ کی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے سامنے اِنِّي جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَة (میں زمین پر ایک خلیفہ مقرر کرنے والا ہوں) کہہ کر حضرت آدم علیہ السلام کی خلافت کا اعلان فرمایا۔ پس جب انسان زمین پر اللہ کا نائب اور خلیفہ ہے تو اس کے لئے لازم ہو گیا کہ وہ اپنی پوری زندگی کو اللہ تعالیٰ کی کامل اطاعت و فرمان برداری میں گزارے، اپنے تمام انفرادی و اجتماعی امور و معاملات اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق طے کرے۔ اگر کوئی شخص مسلمان ہونے کا دعویٰ تو کرے مگر احکام الٰہی کی پیروی نہ کرتا

(۱) النساء آیت ۶۴۔ (۲) النساء آیت ۸۰۔ (۳) ہادیٔ اعظم طبع اول صفحہ ۵۷۷۔

ہوتو اس کا دعویٰ صحیح نہیں ۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو مخاطب کر کے فرمایا۔

یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰکَ خَلِیْفَۃً فِی الْاَرْضِ فَاحْکُمْ بَیْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ
وَلَا تَتَّبِعِ الْھَوٰی فَیُضِلَّکَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ. (۱)

اے داود ہم نے تمہیں زمین پر خلیفہ (نائب) بنایا ہے سو تو انصاف کے ساتھ حکم کیا کر اور نفسانی خواہشات کی پیروی نہ کر ۔ وہ تجھے اللہ کے راستے سے بھٹکا دیں گی ۔

اس آیت میں تین باتیں واضح طور پر بیان کی گئی ہیں ۔

۱۔ خلافت و حکومت اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کی جاتی ہے ۔ اس کا حقیقی سبب اللہ تعالیٰ کی دین ہے ۔ اعلیٰ حسب و نسب اور راہبیت کی بنیاد پر کسی کو اس کا استحقاق حاصل نہیں ۔

۲ ۔ چونکہ خلیفہ اللہ تعالیٰ کا نائب ہوتا ہے اس لئے اس پر لازم ہے کہ وہ تمام فیصلے عدل و انصاف کے ساتھ کرے ۔

۳ ۔ امورِ مملکت و سلطنت میں نفسانی خواہشات کا بالکل دخل نہیں ہونا چاہئے ۔ اگر امور سلطنت کی انجام دہی میں ان کا عمل دخل ہوگیا تو مملکت کا نظم و نسق درہم برہم ہو جائے گا اور آخر کار نفسانی خواہشات اس کو راہِ حق سے بھٹکا دیں گی ۔

نیز حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں فرمایا:

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّہٗ وَاسْتَوٰی اٰتَیْنٰہُ حُکْمًا وَّ عِلْمًا. (۲)

اور جب وہ (حضرت موسیٰ) اپنی بھرپور جوانی کو پہنچا تو ہم نے اس کو حکمت اور علم عطا کیا۔

حضرت داؤد کے بارے میں فرمایا:

فَفَھَّمْنٰھَا سُلَیْمٰنَ وَکُلًّا اٰتَیْنَا حُکْمًا وَّعِلْمًا. (۳)

پھر ہم نے (فیصلہ کرنے کا طریقہ) سلیمان کو سمجھا دیا اور ہم نے دونوں کو حکم اور علم عطا کیا تھا ۔

حضرت لوط کے بارے میں فرمایا:

وَلُوْطًا اٰتَیْنٰہُ حُکْمًا وَّعِلْمًا. (۴)

(۱) ص ۲۶ ۔ (۲) القصص آیت ۱۴ (۳) الانبیاء ۷۹ (۴) الانبیاء آیت ۷۴ ۔

اور ہم نے لوط کو حکم (حکمت و نبوت) اور علم عطا کیا۔

لفظ حکم کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ یہ امر کے معنوں میں بھی آتا ہے اور اتھارٹی کے معنوں میں بھی۔ قوت فیصلہ کے معنوں میں بھی اور حکمت و دانائی کے معنوں میں بھی آتا ہے۔ چنانچہ انبیا علیہم السلام کو بھی اپنی اتباع کرنے والوں پر مکمل اختیار حاصل ہوتا ہے اور ہر متبع پر نبی کی اطاعت لازم ہوتی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَمَا اَرْسَلْنَا مِن رَّسُوْلٍ اِلاَّ لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ. (۱)

اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر یہ کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔

یہ اطاعت اطاعت تک ہی محدود رہنی چاہیے۔ کسی بشر کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ لوگوں سے یہ کہے کہ تم اللہ کو چھوڑ کر میری پرستش کرنے لگو، جیسا کہ ارشاد ہے۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ
لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (۲)

کسی بشر کو زیب نہیں دیتا کہ اللہ تو اس کو کتاب اور حکم (عقل) اور نبوت عطا فرمائے اور وہ لوگوں سے کہنے لگے کہ تم خدا کو چھوڑ کر میرے بندے ہو جاؤ۔

قرآن کریم میں جہاں کہیں یہ فرمایا گیا کہ ہم نے فلاں نبی کو حکم عطا کیا ہے وہیں یہ بھی فرما دیا کہ ہم نے اسے علم بھی عطا کیا ہے۔ اسی قرآنی علم کی روشنی میں اسلامی ریاست کے چند اساسی اصول ہیں۔

## ۱۔ علم و حکمت

قرآن کریم نے ریاست کو جو تصور دیا ہے اس کے مطابق ریاست کی باگ ڈور ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں ہونی چاہیے جو قرآن و حدیث کا پورا پورا علم رکھتے ہوں اور قرآن حدیث میں بتائے گئے امر و نہی سے کامل طور پر نہ صرف آگاہ ہوں بلکہ ان کو نافذ کرنے میں مخلص بھی ہوں اور ان کے نفاذ کی صلاحیت بھی رکھتے ہوں۔

## ۲۔ مشاورت:

اسلامی ریاست کا پورا نظام اہل ایمان کے باہمی مشورے سے چلتا ہے چنانچہ مشورے کے

(۱) النساء آیت ۶۴ (۲) آل عمران آیت ۷۹

بارے میں قرآن کریم میں دو جگہ صریح اور نہایت واضح طور پر آیا ہے۔

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ط فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ. (۱)

اور آپ ﷺ ان (صحابہ) سے کام میں مشورہ لیجئے۔ پھر جب آپ مشورے کے بعد کسی بات کا عزم کرلیں تو اللہ پر بھروسہ کیجئے۔

سورۂ شوریٰ میں سچے مسلمانوں کی صفات بیان کرتے ہوئے ان کی ایک صفت یہ بیان فرمائی کہ:

وَأَمْرُهُمْ شُورٰى بَيْنَهُمْ. (۲)

اور ان کے (اجتماعی) امور باہمی مشورے سے انجام پاتے ہیں۔

یہاں دو لفظ غور طلب ہیں۔ایک ''امر''۔عربی زبان میں لفظ امر کا استعمال حکم اور حکومت کے معنی میں بھی ہوتا ہے اور کسی مہتم بالشان قول و فعل کے لئے بھی۔مذکورہ آیتوں میں دونوں معنوں کا احتمال ہے۔سو ان آیات میں امر کے معنی ہر اس کام کے ہیں جو خاص اہمیت رکھتا ہو، خواہ وہ حکومت سے متعلق ہو یا دوسرے معاملات سے، دوسرا لفظ ''شوریٰ'' ہے جس کے معنی کسی غور طلب معاملے میں لوگوں کی رائے حاصل کرنا۔اس کے بارے میں چند اقوال ملاحظہ فرمایئے۔شوریٰ اس معاملے کو کہتے ہیں جس پر مشورہ کیا جائے۔(۳) اہل الرائے سے مشورہ کرنا۔(۴) ان کے معاملے ذاتی رائے سے طے نہیں پاتے بلکہ باہمی مشورے سے جس امر پر اتفاق ہو جائے اس پر عمل ہوتا ہے۔(۵) وہ اپنے معاملات مشاورت سے چلانے میں اور فیصلہ کرنے میں جلدبازی سے کام نہیں لیتے۔(۶)

پس پہلی آیت کا مطلب یہ ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے کہ آپ غور طلب معاملات میں جن میں حکومت کے متعلقہ معاملات بھی شامل ہیں۔صحابہ کرام سے مشورہ کرلیا کریں۔اسی طرح دوسری آیت کا مطلب یہ ہے کہ مومنوں کے تمام غور طلب معاملات، خواہ وہ حکومت سے متعلق ہوں یا دوسرے امور سے، باہمی مشورے سے طے ہوتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مشورے سے مستغنی تھے کیونکہ ان کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی آتی تھی۔وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ کے حکم سے حقیقت میں امت کی تعلیم مقصود ہے تاکہ امت میں

---

(۱) آل عمران آیت ۱۵۹ (۲) شوریٰ آیت ۳۸ (۳) راغب اصفہانی / المفردات / ص ۲۷۱، ☆ ابن المنظور / لسان العرب / ایران، ۱۴۰۵ھ / ج ۴ / ۴۳۷ (۴) آلوسی / روح المعانی / بیروت / ج ۲۵ / ص ۴۶ (۵) نسفی / مدارک / ج ۴ / ص ۱۰۹، بیضاوی / ص ۴۹ (۶) تفسیر جلالین / ص ۶۴۴۔

مشورے کا طریقہ جاری ہو اور جب کوئی ایسا دینی یا دنیوی امر پیش آجائے جس کے بارے میں کوئی حکم خداوندی منصوص نہ ہو تو اس کے بارے میں ایسے لوگوں سے مشورہ کیا جائے جو مشورہ دینے کے اہل ہوں اور جن کی رائے اور عقل قابل وثوق اور اعتماد ہو۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ جب آیت **وَشَاوِرْ هُمْ فِي الْاَمْرِ** نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ اور اس کا رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) تو اس سے مستغنی ہیں لیکن اللہ نے مشورے کو میری امت کے لئے رحمت بنا دیا ہے، سو جو کوئی مشورہ کرے گا وہ ضرور ہدایت پائے گا اور جو کوئی مشورے کو چھوڑ دے گا وہ ضرور گمراہ ہوگا، (۱)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے اصحاب رسول سے زیادہ کسی کو مشورہ کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ (۲)

## مشورے کی شرعی حیثیت:

بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص کسی کام کا ارادہ کرے اور باہم مشورہ کرنے کے بعد اس کے کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کرے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو صحیح اور مفید صورت کی طرف ہدایت مل جاتی ہے۔

ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

**اذا كانت امراء كم خيار كم و اغنياء كم سمحاء كم امور كم شورى بينكم فظهر الارض خير لكم من بطنها واذا كانت امراء كم شرار كم واغنياء كم تجلاء كم و امور كم الىٰ نساء كم فبطن الارض خير لكم من ظهر ها (۳)**

جب تمہارے حکام تم میں سے بہترین آدمی ہوں اور تمہارے مالدار سخی ہوں اور تمہارے معاملات آپس میں مشورے سے طے ہوتے ہوں تو تمہارے لئے زمین کے اوپر رہنا بہتر ہے اور جب تمہارے حکام بدترین افراد ہوں اور تمہارے مالدار بخیل ہوں اور تمہارے معاملات عورتوں کے سپرد ہوں تو زمین کے اندر دفن ہو جانا تمہارے زندہ رہنے سے بہتر ہوگا۔

---

(۱) روح المعانی / ج ۲۵ / ص ۱۰۶ (۲) مدارک / ج ۱ / ص ۱۹۱ (۳) ترمذی

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جس شخص سے مشورہ طلب کیا جائے وہ امین ہے۔ جب اس سے مشورہ طلب کیا جائے تو اس کو چاہئے کہ وہ اس بارے میں وہی رائے دے جو وہ اپنے لئے تجویز کرتا ہے۔(۱)

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ آپ کے بعد اگر ہمیں کوئی ایسا معاملہ پیش آجائے جس کا حکم قرآن میں صراحتاً نازل نہیں ہوا اور اس کے متعلق ہم نے آپ سے کچھ نہ سنا ہو تو ہم کیا کریں؟ آپ نے ارشاد فرمایا کہ ایسے کام کے لئے اپنے لوگوں میں سے عبادت گزار (فقہا) کو جمع کر کے ان کے مشورے سے اس کا فیصلہ کرو۔ کسی کی تنہا رائے سے فیصلہ نہ کرو۔(۲)

مذکورہ احادیث سے یہ امور بالکل واضح ہیں:

۱۔ صرف ان چیزوں میں مشورہ لینا مسنون ہے جن کے بارے میں قرآن و حدیث کا کوئی واضح اور قطعی حکم موجود نہ ہو۔

۲۔ قطعی اور واضح احکامِ شریعہ کے بارے میں نہ مشورے کی ضرورت ہے اور نہ مشورہ لینا جائز ہے۔

۳۔ مشورہ ان لوگوں سے لینا چاہئے جو تقویٰ اور عبادت گزاری میں ممتاز ہوں۔

۴۔ مشورہ دینے والے کا صاحبِ عقل و رائے ہونا ضروری ہے۔

## آپ ﷺ کا صحابہ کرام سے مشورہ کرنا:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مہمات امور میں صحابہ کرام سے مشورہ فرمایا کرتے تھے۔ صحابہ کرام بھی آپس میں مشورہ کرتے تھے۔ خلافت راشدہ کی تو بنیاد ہی شوریٰ پر قائم تھی۔

غزوۂ بدر کے موقع پر ابتداءً آپ ابوسفیان کے قافلے کو روکنے کی غرض سے مدینے سے نکلے تھے۔ پھر جب آپ نے وادیٔ ذفران میں پڑاؤ ڈالا تو آپ کو اطلاع ملی کہ قریش اپنے قافلے کی حفاظت کے لئے روانہ ہو گئے ہیں۔ اس وقت آپ نے مہاجرین و انصار کو مشورے کے لئے جمع فرمایا اور ان کو قریش کی خبر دی۔ یہ سنتے ہی پہلے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اور پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر اظہار جان نثاری فرمایا۔ پھر حضرت مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم موسیٰ علیہ السلام کی قوم کی طرح ہرگز یہ نہیں کہیں گے کہ اے موسیٰ تم اور

(۱) ہیثمی/ مجمع الزوائد/ بیروت، ۹۴ء/ ج۸/ ص۱۸۱، (۲) روح المعانی/ ج۲۵/ ص۴۶

تمہارا رب دونوں جا کر لڑو ہم تو یہیں بیٹھے ہیں بلکہ ہم آپ کے دائیں اور بائیں، آگے اور پیچھے لڑیں گے۔ پھر حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ آپ صحابہ کرام کا جواب سن کر خوش ہوئے اور فرمایا کہ اللہ کے نام پر چلو۔(۱)

بدر ہی کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے قیدیوں کے بارے میں صحابہ کرام سے مشورہ طلب کیا اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں ان پر قدرت دی ہے، حضرت ابو بکر نے عرض کیا سب اپنے ہی عزیز و اقارب ہیں اس لئے فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے، حضرت عمرؓ کی رائے تھی کہ سب کی گردن اڑا دی جائے۔ حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے ان کو آگ میں جلانے کا مشورہ دیا۔ آپ نے حضرت ابو بکر کی رائے کو پسند فرمایا اور قیدیوں کو فدیہ لے کر چھوڑنے کا حکم دیا (۲)

غزوۂ احد کے موقع پر آپ نے صحابہ سے مشورہ فرمایا کہ مشرکین کا مقابلہ شہر کے اندر رہ کر کیا جائے یا باہر نکل کر۔ پھر صحابہ کرام کے مشورے سے آپ نے مدینے سے باہر نکل کر مقابلے کا فیصلہ فرمایا۔

غزوۂ خندق کے موقع پر بھی آپ نے مہاجرین و انصار کو جمع کر کے ان سے مشورہ طلب کیا۔ مجلسِ مشورہ میں حضرت سلمان فارسی بھی تھے جو انہی دنوں ایک یہودی کی غلامی سے نجات حاصل کر کے اسلام کی خدمت کے لئے تیار ہوئے تھے، انہوں نے مشورہ دیا کہ فارس کے بادشاہ ایسی صورت میں خندق کھود کر دشمن کا راستہ روک دیتے تھے۔ آپ نے حضرت سلمان فارسی کا مشورہ پسند فرمایا۔

بدر کے قیدیوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد ابو العاص بھی تھے۔ اہل مکہ نے جب اپنے اپنے قیدیوں کا فدیہ بھیجا تو حضرت زینب نے اپنے شوہر کے فدیہ میں اپنا وہ ہار بھیجا جو حضرت خدیجہ نے شادی کے وقت ان کو دیا تھا۔ آپ اس کو دیکھ کر آبدیدہ ہو گئے۔ پھر آپ نے صحابہ کرام کے مشورے سے وہ ہار بھی واپس فرما دیا اور ابو العاص کو بھی قید سے رہا کر دیا۔ اس کے چند سال بعد فتح مکہ سے پہلے ابو العاص تجارت کی غرض سے شام کی طرف روانہ ہوئے۔ اہل مکہ کا سرمایہ بھی کے ساتھ تھا۔ شام سے واپسی میں مسلمانوں کے ایک دستے نے ان کا تمام مال ضبط کر لیا۔ پھر آپ نے صحابہ کرام سے مشورے کے بعد ان کا تمام مالِ تجارت واپس کر دیا۔ اس کے نتیجے میں جلد ہی ابو العاص مشرف با سلام ہو گئے۔

ان واقعات سے بجا طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ آپ ریاستی و حکومتی معاملات کے ساتھ ساتھ، سماجی و سیاسی معاملات میں بھی صحابہ کرام سے مشورہ لیا کرتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے

---

(۱) بخاری/ الصحیح/ مصر، ۱۳۵۳ھ/ ج۳/ ص۳ (۲) مسلم فی الغزوۃ البدر باب الامداد بالملائکۃ، مجمع الزوائد/ ج۶/ ص۱۱۶، رقم ۱۰۰۰۸،

بعد صحابہ کرام میں بھی اہم ریاستی اور ایسے دینی امور میں جن کے بارے میں قرآن و حدیث میں کوئی صریح حکم نہ تھا، مشاورت کا طریقہ ہمیشہ جاری رہا۔

## اختلاف رائے کی صورت میں فیصلے کا اختیار

قرآن و حدیث کی رو سے یہ ثابت نہیں کہ اختلاف رائے کی صورت میں، امیر اکثریت کی رائے کے مطابق فیصلے کا پابند ہے بلکہ قرآن و حدیث اور صحابہ کے تعامل کی تصریحات سے یہ واضح ہے کہ اختلاف رائے کی صورت میں امیر اپنی صوابدید کے مطابق کسی ایک رائے کو اختیار کر سکتا ہے۔ خواہ وہ اکثریت کے مطابق ہو یا اقلیت کے مطابق۔ (۱)

## ۳۔ عدل و انصاف

عدل اس کے لغوی معنی آپس کے حقوق میں برابری کرنے کے ہیں یعنی آپس کے حقوق ادا کرتے وقت ظلم کو چھوڑ دینا اور حقدار کو اس کا حق پہنچا دینا۔ اسی لئے لوگوں کے نزاعی معاملات میں انصاف کے ساتھ فیصلہ کرنا عدل کہلاتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ. (۲)

جب تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنے لگو تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو۔

دوسری جگہ ارشاد ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ ط (۳)

بیشک اللہ تمہیں عدل کرنے کا حکم دیتا ہے۔

ابن عربی نے فرمایا کہ لفظ عدل کے اصل معنی برابری کرنے کے ہیں۔ پھر مختلف نسبتوں سے اس کا مفہوم مختلف ہو جاتا ہے۔

**مثلاً:** ۱۔ اگر انسان اپنے نفس اور اپنے رب کے درمیان عدل کرے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ کے حقوق کو اپنی خواہشات پر مقدم جانے اور اس کے احکام کی تعمیل اور اس کی ممنوعات و محرمات سے مکمل اجتناب کرے۔

۲۔ آدمی خود اپنے نفس کے ساتھ عدل کا معاملہ کرے یعنی اپنے نفس کو ایسی تمام چیزوں سے

---

(۱) مفتی محمد شفیع/ معارف القرآن/ کراچی/ ج ۲/ ص ۲۲۵ (۲) النساء آیت ۵۸، (۳) النحل، آیت ۹۰،

بچائے جن میں اس کی جسمانی یا روحانی ہلاکت ہو۔

۳۔تمام مخلوق کے ساتھ ہمدردی وخیر خواہی کا معاملہ کرے۔

۴۔جب دو فریق اپنے کسی معاملے کو فیصلے کے لئے اس کے پاس لائیں تو کسی فریق کی طرف میلان کے بغیر حق کے مطابق فیصلہ کرے۔

۵۔ہر معاملے میں افراط وتفریط چھوڑ کر میانہ روی اختیار کرے۔

ابو عبداللہ رازی نے فرمایا کہ لفظ عدل میں عقیدے کا اعتدال، عمل کا اعتدال اور اخلاق کا اعتدال سب شامل ہیں (۱)

امام راغب اصفہانی کہتے ہیں کہ عدل یہ ہے کہ کسی بوجھ کو دو برابر حصوں میں اس طرح بانٹ دیا جائے کہ ان میں سے کسی میں ذرا بھی کمی بیشی نہ ہو۔(۲)

عدل کا مفہوم بہت وسیع ہے۔اس میں حقوق اللہ بھی داخل ہیں اور انسانی حقوق بھی۔لہذا ہر حقدار کو اس کا پورا پورا حق ادا کرنا چاہئے۔اگر کوئی کسی پر ظلم وزیادتی کرتا ہے تو اس کو ظلم وتعدی سے روکا جائے اور مظلوم کی حمایت کی جائے۔جن لوگوں کو عدل وانصاف کی ذمہ داری سونپی گئی ہے ان کو چاہئے کہ وہ مقدمات میں فریقین کے ساتھ برابری کا معاملہ کریں۔کسی ایک فریق کی طرف میلان نہ کریں۔کسی سرکاری، سیاسی، سماجی اور گروہی حیثیت کو خاطر میں لائے بغیر، معاملے کی پوری تحقیق وتفتیش کے بعد عدل کے ساتھ فیصلہ کریں۔

## عدل کی اہمیت:

ریاست کا سب سے اہم شعبہ عدل کا ہے۔قوانین خواہ کتنے ہی عمدہ اور بہترین کیوں نہ ہوں اور انتظامیہ کیسی ہی مضبوط اور طاقتور کیوں نہ ہو، جب تک تنازعات کا فیصلہ صحیح اور بروقت نہ ہو، حق دار کو اس کا حق نہ دلوا دیا جائے اور ظالم کو ظلم سے نہ روکا جائے اس وقت تک ریاست میں امن کا قیام محال ہے جو لوگ عدل وانصاف کو تباہ کرتے ہیں ان کو عدل تباہ و برباد کر دیتا ہے، اور جو لوگ عدل وانصاف قائم کرتے ہیں تو ان کی عدل وانصاف حفاظت کرتے ہیں۔

## مجرم پر ترس کھانے کی ممانعت:

(۱)احسن البیان/ج۵/ص۱۳۹، (۲)المفردات/ص۲۵

قرآنِ کریم نے جرم ثابت ہونے کے بعد مجرم کو سزا دیتے وقت اس پر ترس کھانے کی ممانعت فرمائی ہے۔ اس لئے کہ یہ عدل کے خلاف ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

اَلزَّانِیَةُ وَالزَّانِیْ فَاجْلِدُوْا کُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ وَّلَا تَاْخُذْ کُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ. (۱)

زانی عورت اور زانی مرد، ان دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو اور تمہیں ان پر ہرگز ترس نہیں آنا چاہئے۔

معاشرے میں سب طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ شریف بھی اور شریر بھی۔ بعض مجرموں کے ساتھ عفو و درگزر کا معاملہ سزا دینے سے زیادہ مفید ثابت ہوتا ہے اور بعض مجرم عفو و درگزر سے اور زیادہ دلیر ہو جاتے ہیں اس لئے ایسے مجرموں کے لئے سزا ہی ضروری ہے۔ البتہ نجی معاملات میں، معاملہ قاضی کے سامنے پیش ہونے سے پہلے مدعی مجرم کو معاف کرنے کا اختیار رکھتا ہے لیکن معاملہ قاضی کے سامنے پیش ہو جانے کے بعد مدعی کا یہ اختیار ختم ہو جاتا ہے۔

عبداللہ بن صفوان اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ وہ مسجد میں اپنی چادر پر سر رکھ کر سوئے ہوئے تھے کہ کسی نے ان کی چادر چرا لی۔ پھر وہ چور کو لے کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے (اعتراف جرم کے بعد) ملزم کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا تو صفوان نے کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں نے اپنی چادر اس کو صدقہ کر دی۔ آپ نے فرمایا تم نے میرے پاس آنے سے پہلے ایسا کیوں نہیں کیا۔ (۲)

عبداللہ بن عمرو بن العاص کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم آپس میں اپنی حدوں کو معاف کرو۔ پھر جب وہ میرے پاس پہنچ جائے گی تو (اس حد کا جاری ہونا) واجب ہو جائے گا۔ (۳)

## بلا امتیاز عدل:

اسلام میں عدل و انصاف کے معاملے میں کسی قسم کا امتیاز روا رکھنے کی اجازت نہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

وَاِذَا حَکَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْکُمُوْا بِالْعَدْلِ. (۴)

(۱) النور آیت ۲ (۲) ابن ماجہ/ السنن/ بیروت/ ج ۳/ ص ۱۵۷، رقم ۲۵۹۵، (۳) ابوداود/ السنن/ بیروت ۹۴ھ/ ج ۴/ ص ۱۲۲، رقم ۴۳۷۶۔ (۴) النساء آیت ۵۸،

اور جب تم لوگوں کے درمیان (کسی تنازع کا) فیصلہ کرنے لگو تو انصاف کے ساتھ کرو۔

اس آیت میں ان کو خطاب ہے جو لوگوں کے باہمی جھگڑوں اور مقدموں کے فیصلے کرتے ہیں۔ انہیں مقدموں کے فیصلے عدل و انصاف کے ساتھ کرنے کی تاکید کی گئی ہے کیونکہ مقدموں کے فیصلوں میں سب انسان برابر ہیں خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم، دوست ہوں یا دشمن، اپنے ہم وطن، ہم رنگ اور ہم زبان ہوں یا غیر۔ اس لئے فیصلہ کرنے والوں کا فرض ہے کہ وہ ان سب تعلقات سے قطع نظر جو بھی حق و انصاف کا تقاضا ہو وہ فیصلہ کریں۔ (۱)

دوسری جگہ ارشاد ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰۤى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ؕ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى. (۲)

اے ایمان والو! اللہ کے واسطے انصاف سے گواہی دینے کے لئے کھڑے ہو جایا کرو اور کسی قوم کی دشمنی کے باعث انصاف کو ترک نہ کرو اور عدل کیا کرو۔ یہی پرہیزگاری سے قریب تر ہے۔

یہ مضمون انہی الفاظ کے ساتھ سورۂ نساء کی آیت ۱۳۵ میں بھی آیا ہے۔ بنیادی طور پر دونوں آیتوں میں مسلمانوں کو ہر حال میں عدل و انصاف پر قائم رہنے اور سچی گواہی دینے کی تاکید کی گئی ہے۔ تقویٰ اور پرہیزگاری کا یہی تقاضا ہے کہ دوست و دشمن کے ساتھ یکساں عدل و انصاف کیا جائے۔ نہ کسی کے ساتھ رعایت ہو اور نہ کسی کی حق تلفی۔

ایک بار حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک عورت کی سفارش کی تو آپ نے سخت ناراضگی کا اظہار کیا اور فرمایا کہ تم سے پہلے لوگ اسی لئے ہلاک ہوگئے کہ وہ کمزوروں پر تو حد قائم کرتے تھے (جرم کی سزا دیتے تھے) اور معزز لوگوں کو چھوڑ دیتے تھے۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، اگر فاطمہ نے بھی یہ کام (چوری) کیا ہوتا تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹ دیتا۔ (۳)

## عدلیہ کی بالادستی:

عدلیہ کی بالادستی کے دعوے تو عموماً سب ہی حکومتیں کرتی ہیں مگر جب ان کے بڑے لوگ عدل و انصاف کی زد میں آتے ہیں تو اس بالادستی کو ختم کرنے کے لئے مختلف حربے اور طریقے اختیار کئے جاتے

(۱) معارف القرآن/ ج۳/ ص۴۴۸ (۲) المائدہ آیت ۸، (۳) بخاری فی الحدود، باب الاقامۃ الحدود علی الشریف والوضیع

ہیں۔مثلاً ججوں کو تبدیل کر دینا، موجود قوانین میں ترمیم و تنسیخ وغیرہ۔لیکن اسلام نے عدلیہ کی بالا دستی کا جو عملی مظاہرہ کیا ہے دنیا کی تاریخ اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔اسلامی تاریخ عدلیہ کی بالا دستی کے واقعات سے بھری پڑی ہے۔خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی ریاست کا بانی حاکم اور قاضی ہوتے ہوئے اپنے آپ کو لوگوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا اے لوگو! میرا تمہارے پاس سے چلے جانے کا زمانہ قریب آگیا ہے اس لئے جس کی کمر پر میں نے مارا ہو تو میری کمر موجود ہے وہ بدلہ لے لے۔آگاہ ہو جاؤ! اور جس کو میں نے برا بھلا کہا ہو وہ مجھ سے بدلہ لے لے۔جس کا مجھ پر کوئی مالی مطالبہ ہو تو میرا یہ مال حاضر ہے وہ اس مال سے بدلہ لے لے۔کوئی شخص یہ خیال نہ کرے کہ مجھ سے بدلہ لینے سے میرے دل میں بغض پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔آگاہ ہو جاؤ! بغض رکھنا، نہ میری طبیعت میں ہے، نہ میرے لئے موزوں ہے۔خوب سمجھ لو کہ تم میں سے وہ شخص مجھے بہت محبوب ہے جو مجھ سے اپنا حق وصول کر لے یا معاف کر دے۔پھر آپ نے فرمایا اے لوگو! جس کے ذمے کوئی حق ہو تو اس کو چاہئے کہ وہ اس حق کو ادا کر دے اور دنیا کی رسوائی کا خیال نہ کرے۔آگاہ ہو جاؤ! دنیا کی رسوائی آخرت کی رسوائی سے بہت کم ہے۔پھر ایک شخص نے کھڑے ہو کر عرض کیا کہ میرے تین درہم آپ کے ذمے ہیں۔پھر آپ نے حضرت فضیل سے فرمایا کہ اس کو تین درہم دے دو۔اس کے بعد ایک شخص نے اٹھ کر عرض کیا کہ میرے ذمے بیت المال کے تین درہم ہیں جو میں نے خیانت سے لئے تھے۔آپ نے فرمایا کہ تو نے خیانت کیوں کی تھی؟ اس نے عرض کیا کہ اس وقت مجھے سخت ضرورت تھی۔آپ نے حضرت فضیل سے فرمایا کہ ان سے وصول کر لو۔(۱)

ابو حدرد اسلمیؓ ایک صحابی تھے جن پر ایک یہودی کا قرض تھا اور ان کے پاس بدن کے کپڑوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ابو حدرد نے یہودی سے کچھ مہلت طلب کی لیکن وہ نہ مانا اور ان کو پکڑ کر آپ کی خدمت میں لے گیا۔آپ نے فرمایا کہ ان کا قرض ادا کر دو۔انہوں نے عذر کیا آپ نے پھر فرمایا کہ انہوں نے پھر وہی جواب دیا اور عرض کیا یا رسول اللہ! غزوۂ خیبر قریب ہے۔شاید وہاں سے واپسی پر کچھ ہاتھ آئے تو میں اس کو ادا کر دوں۔آپ نے پھر یہی حکم دیا کہ فوراً ادا کر دو۔آخر انہوں نے اپنا تہ بند اس یہودی کو قرض میں دے دیا اور سر پر جو عمامہ بندھا ہوا تھا اس کو کھول کر کمر سے لپیٹ لیا۔(۲)

## ۴۔احتساب و مواخذہ:

اسلامی نظام حکومت میں حاکم کے فرائض منصبی میں یہ بھی داخل ہے کہ وہ وقتاً فوقتاً حکومت

(۱) مجمع الزوائد/ ج۸/ص۵۹۶، رقم ۱۴۵۲ (۲) شبلی نعمانی/ سیرت النبی/ کراچی/ ج۲/ص۱۸۷

کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے عمال و حکام کا احتساب کرتا رہے۔ مدینہ طیبہ میں اسلامی ریاست کے قیام کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود معاشی و دیگر امور کی نگرانی فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ بازار تشریف لے گئے تو آپ نے غلہ کا ایک انبار دیکھا۔ آپ نے اس کے اندر ہاتھ ڈالا تو اس میں نمی محسوس ہوئی آپ نے دکان دار سے فرمایا کہ یہ کیا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ یہ بارش میں بھیگ گیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ پھر اس کو اوپر کیوں نہیں کیا، تا کہ ہر شخص کو نظر آئے۔ پھر فرمایا۔

**لاتغش بین المسلمین، من غشنا فلیس منا (۱)**

مسلمانوں کے باہمی معاملات میں دھوکہ دہی نہیں ہونی چاہئے۔ جس نے ہمیں دھوکہ دیا وہ ہم میں سے نہیں۔

حضرت ابوحمید ساعدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو بنی سلیم کے صدقات وصول کرنے کے لئے اپنا عامل مقرر کر کے روانہ فرمایا۔ جب وہ مال وصول کر کے لوٹا تو آپ نے رقوم کا حساب طلب کیا۔ اس پر وہ کہنے لگا کہ یہ تو آپ کا مال ہے یعنی وصول شدہ صدقات ہیں اور یہ مجھے ہدیہ (تحفہ) ملا ہے۔ یہ سن کر آپ سخت غصے ہوئے اور فرمایا۔

**فھلا جلست فی بیت ابیک و امک حتی تاتیک ھدیتک ان کنت صادقا۔**

اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو تو تم کیوں نہ اپنے ماں باپ کے گھر بیٹھے رہے، یہ ہدیہ وہیں تمہارے پاس آجاتا؟

پھر آپ نے ایک خطبہ ارشاد فرمایا جس میں آپ نے اس عمل کی سخت مذمت فرمائی۔ (۲)

خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے منصب خلافت سنبھالتے ہی اپنے پہلے خطبے میں ارشاد فرمایا:

اے لوگو! میں تمہاری ہی طرح کا ایک آدمی ہوں ...... میں نبی اکرم ﷺ کا متبع ہوں، کوئی نیا راستہ نکالنے والا نہیں ہوں، سو اگر تم مجھے حق پر دیکھو تو میری اعانت کرو اور اگر باطل پر دیکھو تو مجھے درست کرو۔ (۳)

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اپنے گورنروں اور عمال کو یہ ہدایات دیکر روانہ فرمایا کرتے تھے

(۱) دارمی/السنن/کراچی/ ج ۲/ص ۳۲۳/ رقم ۲۵۴۱، (۲) بخاری/ ج ۴/ص ۱۴۶ (۳) احمد ذکی صفوت/جمہرۃ خطب العرب/ بیروت/ ج ۱/ص ۱۸۱، (۴) بلاذری/فتوح البلدان/ص ۲۱۹

کہ عمدہ ترکی گھوڑے پر سوار مت ہونا۔ میدہ استعمال نہ کرنا۔ باریک پوشاک مت پہننا اور ضرورت مندوں پر اپنے دروازے بند نہ کرنا۔ اگر ان میں سے کوئی بات کی تو تمہارے لئے سزا حلال ہو جائے گی۔(۴)

بلاذری کا بیان ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب کسی شخص کو عامل مقرر فرماتے تو اس کے مال و اسباب کی فہرست تیار کر کے رکھ لیتے تھے، پھر اگر اس دوران اس کی مالی حالت میں اضافہ ہوتا تو زائد رقم اس سے لے لیتے تھے۔(۱)

اس کے علاوہ انہوں نے تمام عمال کو حکم دے رکھا تھا کہ وہ حج کے موقع پر حاضر ہوں۔ وہ تمام لوگوں کی موجودگی میں اعلان کرتے تھے کہ اگر کسی کو کسی عامل کے بارے میں کوئی شکایت ہو تو وہ بیان کرے۔ چنانچہ اس وقت جو بھی شکایت پیش ہوتی، تحقیق و تفتیش کے بعد اس کا ازالہ کیا جاتا تھا۔(۲)

ایک دفعہ تمام عمال جمع تھے۔ ایک شخص نے اٹھ کر کہا کہ آپ کے عامل نے مجھے بے قصور سو کوڑے مارے ہیں۔ حضرت عمر نے مستغیث کو حکم دیا کہ وہیں مجمع عام میں عامل کو سو کوڑے لگائے۔ حضرت عمرو بن العاص نے کھڑے ہو کر کہا کہ یہ امر عمال پر گراں ہوگا۔ حضرت عمر نے فرمایا لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ میں ملزم سے انتقام نہ لوں۔(۳)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے پاس آنے والے وفود سے پوچھا کرتے تھے کہ تمہارا امیر کیسا ہے۔ کیا وہ تمہارے بیماروں کی عیادت کرتا ہے؟ کیا کوئی غلام بیمار ہوتا ہے تو وہ اس کی عیادت کو جاتا ہے؟ وہ کمزور کے ساتھ کیسا سلوک کرتا ہے؟ وہ بیکسوں کے دروازوں پر بیٹھنے میں اپنی ہتک تو محسوس نہیں کرتا؟ اگر جواب نفی میں ملتا اور معلوم ہو جاتا کہ وہ ان ہدایات کی خلاف ورزی کرتا ہے تو اسے فوراً معزول کر دیتے تھے۔(۴)

## ۵۔ اقتصادی نظام

اسلام نے جو اقتصادی نظام دیا ہے وہ اپنی افادیت کی بنا پر دنیا کا بہترین اقتصادی نظام ہے جو اعتدال اور توازن پر قائم ہے۔ اس کے اہم نکات یہ ہیں۔

**(الف)** استحصال کی بیخ کنی: اسلام میں ایک دوسرے کے استحصال کی سخت ممانعت ہے، ارشادِ باری ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ (۵)

اے ایمان والو! تم آپس میں ایک دوسرے کے اموال ناحق نہ کھایا کرو، ہاں

(۱) ایضاً (۲) شبلی نعمانی/ الفاروق/ ملتان/ ۵۲ء/ ص ۳۲۵ (۳) ایضاً ص ۳۲۶ (۴) ایضاً (۵) النساء آیت ۲۹

اگر آپس کی رضامندی سے تجارتی لین دین ہو تو کوئی مضائقہ نہیں۔

اس آیت میں مومنوں کو ایک دوسرے کے اموال باطل طریقے سے کھانے کی ممانعت کی گئی ہے۔ باطل طریقے سے مال کھانے میں اسراف، غیر شرعی کاموں خرچ کرنا، دھوکہ، چوری، ڈاکہ، غصب، خیانت، جوا، سود اور اسی طرح کے تمام ناجائز اور غیر شرعی طریقے شامل ہیں۔ البتہ جائز تجارتی لین دین یا ملازمت و مزدوری وغیرہ کے ذریعے ایک کا مال دوسرے کے لئے ممنوع نہیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم جو کچھ کھاتے ہو اس میں پاکیزہ ترین وہ ہے جو تمہارے ہاتھوں کی کمائی ہو اور تمہاری اولاد (کی کمائی) بھی تمہاری کمائی ہے۔ (۱)

دوسری جگہ ارشاد ہے۔

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰہُ بِہٖ بَعْضَکُمْ عَلٰی بَعْضٍ ط لِلرِّجَالِ نَصِیْبٌ
مِّمَّا اکْتَسَبُوْا ط وَلِلنِّسَآءِ نَصِیْبٌ مِّمَّا اکْتَسَبْنَ ط (۲)

اور تم اس چیز کی تمنا نہ کرو جس میں اللہ تعالیٰ نے تم میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت عطا فرمائی ہے۔ مردوں کے لئے ان کی کمائی سے ان کا حصہ ہے اور عورتوں کے لئے ان کی کمائی سے ان کا حصہ ہے۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تم میں سے بعض کو بعض پر جو شرف و امتیاز اور فضیلت عطا فرمائی ہے تم اس کی آرزو اور تمنا نہ کرو کیونکہ یہ شرف و فضیلت تو اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ ہے۔ اس کی تمنا کرنے سے حسد و جلن کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا اس لئے ہر شخص کو چاہئے کہ وہ نیکیوں میں سبقت کرنے کی کوشش کرے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کے قرب اور آخرت کے ثواب میں اضافہ ہوگا۔ استحصال سے پاک معاشرے میں جو شخص بھی حلال طریقے سے کمائے گا وہ اس کا حصہ ہے۔

**(ب)** زکوٰۃ اور عشر: زکوٰۃ ایک مالی فریضہ اور عبادت ہے جو سابقہ تمام انبیا کی شریعتوں میں بھی دینی فریضے کی حیثیت سے جاری رہی۔ یہ اسلام کا تیسرا رکن ہے۔ شرعی اصطلاح میں زکوٰۃ کے معنی یہ ہیں کہ اپنے مال کا ایک خاص حصہ جو شرع نے مقرر کیا ہے کسی مسلمان فقیر یا مسکین وغیرہ کو جو شرعی اعتبار سے زکوٰۃ لینے کا حقدار ہو اس طرح مالک بنا دینا کہ خود اس سے کسی قسم کا نفع حاصل نہ کرے۔ اسلام نے سونے چاندی اور نقدی پر چالیسواں حصہ زکوٰۃ مقرر کی ہے۔ اور زمین کی پیداوار پر دسواں (اور بعض حالات میں بیسواں) حصہ مقرر ہے۔

(۱) ابن ماجہ/ السنن/ بیروت ۱۹۸/ ج ۳/ ۵۱ رقم ۲۲۹۰ (۲) النساء آیت ۳۲

نماز کی طرح زکوٰۃ کی بھی بڑی اہمیت ہے۔قرآن کریم میں خاص طور پر ان سورتوں میں جو ہجرت سے پہلے مکے میں نازل ہوئیں، نماز کے ساتھ ساتھ زکوٰۃ کا حکم بھی موجود ہے جیسے

اور وہ نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی فرماں برداری کرتے ہیں۔(۱)

اور اللہ نے مجھے زندگی بھر نماز پڑھنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کی تاکید کی ہے۔(۲)

اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو۔(۳)

زکوٰۃ کے تفصیلی احکام نازل ہونے سے پہلے صحابہ کرام کی یہی عادت تھی کہ جو کچھ کماتے اس میں سے اپنی ضروریات پوری کرنے کے بعد جو بچ جاتا وہ سب صدقہ کردیتے تھے اور ہر شخص اپنی اپنی زکوٰۃ خود ادا کرتا تھا۔پھر یہ آیت نازل ہوئی۔

آپ ان کے مالوں میں سے صدقہ لیجئے جس کے ذریعے آپ ان کو پاک و صاف کردیں گے اور آپ ان کے لئے دعا کیجئے۔بلاشبہ آپ کی دعا ان کے لئے موجب اطمینان ہوگی۔(۴)

اس آیت کے نزول کے بعد زکوٰۃ کا وصول کرنا اور اس کے مصارف پر خرچ کرنا اسلامی حکومت کا فریضہ قرار دیا گیا۔(۵)

(**ھ**) سود کی حرمت: دوسری برائیوں کی طرح عربوں میں سودی لین دین بھی عام تھا۔دولت مند لوگ غریبوں کو بھاری شرح سود پر قرض دیتے تھے اور جب تک قرض وصول نہ ہوتا وہ سود کو قرض میں شامل کرتے جاتے تھے۔

**بیع اور سود میں فرق:** بیع میں جو نفع اور زیادتی ہوتی ہے وہ مال کے عوض اور مقابلے میں ہوتی ہے اور سود میں جو نفع اور زیادتی ہے وہ بلا عوض ہوتی ہے مثلاً کسی نے ایک درہم کا کپڑا خرید کر دو درہم میں فروخت کردیا تو یہ دونوں درہم کپڑے کے عوض اور مقابل سمجھے جائیں گے۔اور اگر کسی نے ایک درہم کو دو درہم میں فروخت کیا تو ایک درہم تو ایک درہم کے مقابل اور عوض میں ہو جائے گا اور دوسرا درہم بلا عوض اور مقابلے کے ہوگا۔اس لئے یہ سود ہوگا جس کو اللہ تعالیٰ نے حرام ٹھہرایا ہے۔بیع میں قابل معاوضہ چیزوں کا مبادلہ ہوتا ہے اور ربوا اصل قرض پر کچھ زیادہ لینے کو کہتے ہیں اور یہ زیادتی ادائیگی کے وقت میں مہلت اور تاخیر کے بدلے میں کی جاتی ہے۔وقت میں تاخیر اور مہلت نہ تو عقلاً کوئی مال ہے اور نہ عرفاً کوئی ایسی

---

(۱) توبہ آیت ۷۱ (۲) مریم ۳۱ (۳) مزمل ۲۰ (۴) توبہ آیت ۱۰۳ (۵) مولانا سید زوار حسینؒ عمدۃ الفقہ/ ادارہ مجددیہ/ ج ۳/ ص ۱۲

چیز ہے جس پر قبضہ کیا جا سکے اور عوض اور مقابل بن سکے۔ جو چیز بلا عوض اور بدل حاصل کی جائے وہ باطل اور نا حق ہے۔ پس جس نے بیع اور سود کو برابر قرار دیا اس نے بدحواسی سے کام لیا۔ اس لئے اس کو قبر سے دیوانہ اور حواس باختہ اٹھایا جائے گا جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہے۔

اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ
مِنَ الْمَسِّ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ (۱)

جو لوگ سود کھاتے ہیں (قیامت کے روز) وہ اس شخص کی طرح کھڑے ہوں گے جس کے حواس شیطان نے لپٹ کر کھو دیئے ہوں یعنی وہ حیران حواس باختہ کھڑے ہوں گے۔ یہ اس لئے کہ انہوں نے کہا تھا کہ تجارت بھی تو سود کی مانند ہے۔ (۲)

**بیع اور سود کے نفع کی مثال:** جو لوگ بیع کے نفع کو سود کی مانند نفع اور زیادتی کہتے ہیں اور دونوں میں کوئی فرق نہیں کرتے، ان سے سوال کیا جا سکتا ہے کہ جیسے بیوی عورت ہے اسی طرح ماں بھی عورت ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ بیوی تو حلال ہے اور ماں حرام ہے۔ یا یہ پوچھا جائے کہ کتا بھی بکری کی طرح ایک چوپایہ جانور ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ بکری تو حلال ہے اور کتا حرام ہے۔ (۳)

حقیقت یہ ہے کہ بیع کے حلال اور سود کے حرام ہونے کا فیصلہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے جو تمام کائنات اور مخلوقات کا خالق و مالک ہے اور اس کو مخلوق کے لئے ہر قسم کے فیصلے اور احکام جاری کرنے کا حق حاصل ہے، وہ قادر مطلق ہے، اس کے کسی فیصلے اور حکم کو مخلوق میں سے کوئی بھی تبدیل نہیں کر سکتا، اس کا حکم حتمی ہے۔

**ربٰوا کی قسمیں:** ربٰو دو قسم کا ہوتا ہے۔

۱۔ ربٰوا النسیئہ، زمانہ جاہلیت میں اس کا طریقہ یہ تھا کہ کوئی شخص کسی دوسرے شخص کو مقررہ مدت کے لئے کچھ رقم قرض دیتا اور اس کے اوپر کچھ ماہوار مقرر کر لیتا تھا۔ جب مقررہ مدت پر وہ قرض ادا نہ ہوتا تو قرض دینے والا سود کو قرض کی اصل رقم میں شامل کر کے قرض کی مدت بڑھا دیتا تھا۔ اس مدت کے ختم ہونے پر بھی اگر قرضدار اپنی مجبوری سے قرض ادا نہ کر سکتا تو سود خور پھر سود کو اصل رقم میں شامل کر کے اس پر سود لگا دیتا تھا۔ اس طرح سود در سود مل ملا کر قرض پر دی ہوئی رقم کئی گنا بڑھ جاتی تھی۔ قرآن کریم نے اسی کو اضعافاً مضاعفہ کہا ہے۔ اسلام سے پہلے عرب میں یہی سود رائج تھا۔

۲۔ ربٰوا الفضل: یہ وہ سود ہے جو ایک ہی جنس کی چیزوں کو کمی بیشی کے ساتھ تبدیل کرنے میں

(۱) البقرہ آیت ۲۷۵ (۲) مولانا محمد ادریس کاندھلوی/ معارف القرآن/ لاہور/ ج ۱/ ص ۴۱۵ (۳) ایضاً/ ص ۴۱۶

ہوتا ہے مثلاً ایک سیر گیہوں کو سوا سیر یا ڈیڑھ سیر گیہوں کے بدلے میں فروخت کیا جائے یا پرانے ایک سو دس روپے کے بدلے میں نئے سو روپے دیئے جائیں وغیرہ(۱)

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سونے کے بدلے سونا برابر برابر بیچو اور چاندی کے بدلے چاندی برابر برابر بیچو، اور کھجور کے بدلے کھجور برابر برابر اور گیہوں کے بدلے گیہوں برابر بیچو اور نمک کے بدلے نمک برابر بیچو اور جو کے بدلے جو برابر برابر بیچو، پس جس نے زیادہ لیا یا زیادہ دیا تو اس نے سود کا معاملہ کیا۔ پھر سونے کو چاندی کے عوض نقد و نقد جس طرح چاہو خرید و فروخت کرو اور گیہوں کو کھجور کے عوض جس طرح چاہو خرید و فروخت کرو بشرطیکہ نقد و نقد ہو۔(۲)

اسلام نے شراب کی حرمت کی طرح، سود کی لعنت کو بھی بتدریج ختم کیا۔ چنانچہ سود کے بارے میں سب سے پہلے یہ حکم نازل ہوا۔

اے ایمان والو! دوگنا، چوگنا سود نہ کھاؤ اور اللہ سے ڈرو تا کہ فلاح پاؤ(۳)

اس کے بعد آپ نے ہم جنس اشیا کو باہم کم و بیش کر کے تبدیل کرنے سے منع فرمایا اور غزوۂ خیبر کے موقع پر اعلان فرمایا کہ سونے کو اشرفی کے بھاؤ گھٹا بڑھا کر بیچنا بھی سود ہے۔ پھر یہ آیت نازل ہوئی۔

جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ (قبروں سے) اس طرح (حواس باختہ) اٹھیں گے
جیسے شیطان نے کسی کو چھو کر حواس باختہ کر دیا ہو، یہ اس لئے کہ وہ کہتے ہیں کہ
بلاشبہ بیع بھی سود کی مانند ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے بیع کو تو حلال کر دیا اور سود کو حرام
کر دیا پس جس کو اس کے رب کی طرف سے نصیحت کی بات پہنچی اور وہ باز آ گیا تو
اس کو وہی لینا چاہئے جو اس نے پہلے دیا اور اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے اور جو
پھر لینے لگا تو ایسے لوگ دوزخی ہیں اور وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔(۴)

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں سود خوروں کے بدانجام اور حشر میں ان کی رسوائی و گمراہی کو بیان کیا ہے، پھر اسی آیت میں سود خوروں کی اس سزا کا سبب بیان فرمایا کہ ان لوگوں نے دو جرم کئے۔ ایک تو سود کے ذریعہ حرام مال کھایا دوسرے سود کو حلال سمجھا اور جو لوگ سود کو حرام کہتے ہیں ان کے جواب میں سود کو خرید و فروخت کی مانند قرار دیا اور کہا کہ جس طرح بیع و شرا کے ذریعے نفع حاصل کیا جاتا ہے اسی طرح سود کے ذریعے نفع حاصل کیا جاتا ہے۔ اگر سود حرام ہے تو خرید و فروخت بھی حرام ہونی چاہئے۔

(۱) مولانا محمد ادریس کاندھلوی/ معارف القرآن/ لاہور/ ج ۱/ ص ۴۱۵ (۲) ترمذی/ السنن/ بیروت ۹۴ء/ ج ۳/ ص ۱۹، رقم ۱۲۴۴ (۳) آل عمران آیت ۱۳۰ (۴) البقرہ آیت ۲۷۵

اس کے بعد اسی آیت میں اللہ تعالیٰ نے بیع کو سود کی مانند قرار دینے والوں کے جواب میں حکماً فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کے نفع و نقصان سے پوری طرح باخبر ہے اس لئے اسی نے بیع حلال اور سود کو حرام قرار دیا ہے۔ پھر دونوں برابر کیسے ہو سکتے ہیں۔ جو لوگ سود کا حکم پہنچنے کے بعد بھی سود خوری پر قائم رہیں گے اور سود کو بیع کی مانند قرار دیں گے تو وہ لوگ گنہگار اور دوزخی ہیں۔ وہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔

اس کے بعد سورۂ بقرہ کی یہ آیات نازل ہوئیں۔

> اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور جو سود باقی رہ گیا ہے اس کو چھوڑ دو، اگر تم سچے مومن ہو۔ پھر اگر تم ایسا نہ کرو گے تو اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) سے لڑنے کے لئے تیار ہو جاؤ اور اگر تم نے توبہ کرلی تو تمہیں اپنے اصل مال لینے کا حق ہے۔ نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ تم پر کوئی ظلم کرے۔(۱)

سود کی حرمت نازل ہونے سے پہلے عرب میں سود کا لین دین عام تھا۔ جب سود کی ممانعت میں پہلی آیتیں نازل ہوئیں تو مسلمانوں نے سود کا لین دین ترک کر دیا مگر کچھ لوگوں کی سود کی رقم قرض داروں کے ذمے واجب الادا تھی اس لئے ان کو خیال پیدا ہوا کہ ممانعت سے پہلے کا جو سود لوگوں کے ذمے ہے، اس کو لے لینا چاہئے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان کے اس خیال کو رد فرماتے ہوئے ان کو حکم دیا کہ اگر تم سچے مومن ہو تو جو کچھ سود قرض دار کے ذمے باقی رہ گیا ہے اس کو چھوڑ دو اور صرف اپنا اصل مال لے لو۔ اس کے بعد اسی آیت میں سود کی مخالفت کرنے والوں کے لئے سخت وعید ہے کہ اگر انہوں نے سود کو ترک نہ کیا تو ان کو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے جنگ کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ قرآن کریم میں ایسی شدید وعید کفر کے سوا کسی اور بڑے سے بڑے گناہ پر بھی نہیں آئی۔

سود کی حرمت کا مذکورہ قانون نافذ ہونے کے بعد مسلمان تو اس کے پابند تھے ہی۔ جو غیر مسلم قبائل بطور صلح و معاہدہ اسلامی قانون کو قبول کر چکے تھے وہ بھی اس کے پابند ہو چکے تھے لیکن اس کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے خطبے میں اس قانون کے اعلان کے ساتھ اس بات کا اظہار فرمایا کہ یہ قانون کسی خاص شخص یا قوم یا مسلمانوں کے مالی مفاد کے پیش نظر نہیں بلکہ پوری انسانیت کی تعمیر اور صلاح و فلاح کے لئے جاری کیا گیا ہے۔ اسی لئے سب سے پہلے ہم مسلمانوں کی سود کی بڑی رقم جو غیر مسلموں کے ذمہ تھی، اس کو چھوڑتے ہیں تو اب ان کو بھی اپنے سود کی باقی ماندہ رقم چھوڑنے میں کوئی عذر

---

(۱) البقرہ آیت ۲۷۸، ۲۷۹

نہیں ہونا چاہئے۔ چنانچہ آپ نے اسی خطبہ میں ارشاد فرمایا۔ کہ زمانہ جاہلیت میں جو سودی معاملات کئے گئے، سب کا سود چھوڑ دیا گیا۔ اب ہر شخص کو (صرف) اصل رقم ملے گی، سود کی زائد رقم نہ ملے گی۔ نہ تو زیادتی وصول کر کے تم کسی پر ظلم کر سکو گے اور نہ کوئی اصل راس المال میں کمی کر کے تم پر ظلم کر سکے گا اور سب سے پہلا جو سود چھوڑا تھا وہ عباس ابن عبدالمطلب کا سود ہے جس کی بہت بھاری رقمیں غیر مسلموں کے ذمے بطور سود عائد ہوتی تھیں۔(۱)

## ۲۔ جہاد و دفاع:

لفظ جہاد جہد سے مشتق ہے اور طاقت کے معنوں میں آتا ہے۔ شریعت کی اصلاح میں اللہ تعالٰی کی رضا اور خوشنودی اور محض اللہ تعالٰی کے دین کا بول بالا کرنے کے لئے اللہ تعالٰی کے دشمنوں اور باغیوں سے اللہ تعالٰی کی راہ میں انتہائی جانبازی اور جاں نثاری کے ساتھ لڑنے کو جہاد کہتے ہیں۔ اگر قومیت، وطنیت، حصول مال و زر، اظہار شجاعت و بہادری، دنیاوی نمود اور سلطنت و مملکت میں توسیع وغیرہ کے لئے لڑا جائے تو اللہ تعالٰی اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک وہ جہاد نہیں بلکہ ایک قسم کی جنگ ہے۔

بخاری و مسلم میں حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سوال کیا گیا کہ انسان کبھی اظہار شجاعت کے لئے جنگ کرتا ہے اور کبھی قومی غیرت و حمیت کی بنا پر اور کبھی دنیاوی نمود و شہرت کے لئے۔ ان میں سے کونسی جنگ جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ آپ نے فرمایا کہ جو شخص صرف اس لئے لڑے کہ اللہ تعالٰی ہی کا کلمہ بلند رہے، وہ جہاد فی سبیل اللہ ہے۔

جہاد اسلام کے ساتھ مخصوص نہیں۔ گزشتہ انبیا کو بھی جہاد کا حکم تھا۔ اگر جہاد کی اجازت نہ ہوتی تو اللہ کا نام لینا مشکل ہو جاتا اور تمام عبادت خانے مسمار کر دیئے جاتے۔ اللہ تعالٰی کی یہ قدیم سنت ہے کہ وہ اپنے مخلص بندوں کو جہاد کا حکم دیتا ہے تاکہ مفسدوں کا فتنہ اور شر ختم ہو جیسا کہ ارشاد ہے۔

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْفَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ۝ (۲)

اگر اللہ تعالٰی مومنوں اور نیک لوگوں کے ذریعے کافروں اور فاجروں کو دفع نہ کرتا تو کفار و مشرکین روئے زمین پر غالب آ کر فساد برپا کر دیتے مگر اللہ تعالٰی اپنی مخلوق پر بہت فضل کرنے والا ہے۔

(۱) معارف القرآن/ج ۱/ص ۶۵۵ (۲) البقرہ آیت ۲۵۱

قرآن مجید نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے مقاصد میں سے ایک مقصد یہ بھی بیان کیا ہے کہ اسلام کو دنیا کے تمام مذاہب پر غلبہ حاصل ہو۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝ (۱)

وہ اللہ ہی تو ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق دیکر بھیجا تا کہ وہ اس (دین حق) کو (دنیا کے) تمام ادیان پر غالب کر دے اگر چہ وہ مشرکین کو نا گوار ہی ہو۔

اسی لئے قرآن کریم نے مسلمانوں پر جہاد فرض کیا ہے اور اس کی بڑی تاکید بیان کی گئی ہے۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۗ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ (۲)

(اے مسلمانو!) تم پر جہاد فرض کیا گیا ہے اور وہ (جہاد) تمہیں گراں معلوم ہوتا ہے اور ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں گراں معلوم ہو اور وہ تمہارے لئے بہتر ہو اور ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں پسند ہو اور وہ تمہارے حق میں شر ہو اور (ہر چیز کا انجام) اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

دوسرے جگہ ارشاد ہے۔

وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَاۤفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَاۤفَّةً ۗ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ۝ (۳)

اور تم سب مل کر مشرکوں سے قتال کرو جیسا کہ وہ سب مل کر تم سے قتال کرتے ہیں۔ اور جان لو کہ اللہ پرہیز گاروں کے ساتھ ہے۔

جہاد کے حکم سے کوئی بھی مستثنیٰ نہیں حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے خود حضور ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ۗ (۴)

اے نبی ﷺ! آپ کافروں اور منافقوں سے جہاد کیجئے اور ان پر سختی کیجئے۔

اس کے ساتھ ہی آپ کو حکم دیا گیا کہ آپ مومنوں کو بھی جہاد کی ترغیب دیجئے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ ۗ (۵)

(۱) الصّف آیت ۹ (۲) البقرہ آیت ۲۱۶ (۳) التوبہ آیت ۳۶ (۴) التوبہ آیت ۷۳ (۵) انفال آیت ۶۵

اے نبی (ﷺ) آپ مسلمانوں کو جہاد پر ترغیب دلایئے۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ کے راستے میں گزرنے والی ایک صبح یا ایک شام دنیا و مافیہا سے بڑھ کر ہے۔ (۱)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے۔ جو شخص بھی اللہ کے راہ میں زخمی ہوا اور اللہ خوب جانتا ہے کہ اس کے راستے میں کون زخمی ہوا ہے، وہ قیامت کے روز اس طرح آئے گا کہ اس کے زخموں سے خون بہہ رہا ہوگا (جس کا) رنگ تو خون ہی جیسا ہوگا لیکن خوشبو مشک جیسی ہوگی۔ (۲)

## جنگ میں کامیابی کا راز:

قرآن کریم میں ارشاد ہے۔

اے ایمان والو! جب کافروں کی کسی جماعت سے تمہارا مقابلہ ہو جائے تو تم
ثابت قدم رہو اور کثرت سے اللہ کو یاد کرو۔ تاکہ تمہیں کامیابی حاصل ہو۔ (۳)

اس آیت میں اللہ تعالٰی نے دشمن سے مقابلے میں کامیابی کے لئے مسلمانوں کو دو باتوں کی تاکید فرمائی ہے۔

۱۔ دشمن سے مقابلے کے وقت میدان جنگ میں ثابت قدم رہو کیونکہ جنگ میں ثابت قدم اور جمے رہنا ہی سب سے مؤثر اور کامیاب ہتھیار ہے۔

۲۔ جنگ کے دوران اللہ تعالٰی کو کثرت سے یاد کرنا۔

جنگ میں اللہ تعالٰی کو کثرت سے یاد کرنا ایک ایسا ہتھیار ہے جس سے مسلمانوں کے سوا تمام دنیا غافل اور بے خبر ہے۔ تمام غیر مسلم ترقی یافتہ او رترقی پذیر قومیں اپنی مہارت اور وسائل کے اعتبار سے جنگ کے لئے بہترین اور جدید اسلحہ مہیا کرتی ہیں مگر اسلام کے اس روحانی ہتھیار سے ناواقف ہیں۔ اس لئے جب بھی مسلمانوں نے ان اصولوں پر عمل پیرا رہتے ہوئے کسی کافر قوم سے مقابلہ کیا تو دشمن کی تمام جنگی صلاحیت و قوت مفلوج ہو کر رہ گئی کیونکہ فوج کو ثابت قدم رکھنے کے لئے اللہ تعالٰی کے ذکر سے بہتر کوئی نسخہ نہیں جس سے غیر مسلم محروم ہیں۔ وہ اللہ ہی کو نہیں مانتے تو اس کو یاد کیا کریں گے۔ اللہ تعالٰی کی یاد

(۱) بخاری/ ج۲/ ص۳۹۲ (۲) ایضاً ص۳۹۳ (۳) انفال آیت ۴۵

انسان کی ہر مصیبت و پریشانی کو اس طرح ختم کر دیتی ہے جس طرح ہوا بھاپ کو تحلیل کر دیتی ہے۔

## حربی وسائل کی فراہمی

اسلامی ریاست کو دشمن سے محفوظ و مامون رکھنے کے لئے ہر وقت چوکنا اور محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے جس قدر وسائل بھی ممکن ہوں اور جہاں سے بھی حاصل ہو سکتے ہوں ان کو مہیا کرنا چاہئے۔ تاکہ دشمن مسلمانوں کی قوت و شوکت کو دیکھ کر مغلوب و مرعوب ہو جائے اور مقابلے کے لئے کبھی سر اٹھانے کی جرأت نہ کر سکے۔

قرآن کریم نے اسلامی ریاست کے دفاع اور کفار کے مقابلے کے لئے سامان جنگ کی تیاری کے حکم کے ساتھ "جس قدر تم سے ہو سکے" کی سہولت و اختیار دے کر یہ بتا دیا کہ تمہاری کامیابی کے لئے یہ ضروری نہیں کہ تمہارے پاس بھی ویسا ہی اور اتنی ہی مقدار میں سامان حرب ہو جیسا اور جتنا تمہارے دشمن کے پاس ہے بلکہ تم اپنی مقدور بھر سامان حرب مہیا کر لو، پھر اللہ پر بھروسہ رکھو تو اس کی تائید و نصرت تمہارے ساتھ ہوگی۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ
عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ (۱)

اور تم کافروں سے مقابلے کے لئے وہ تمام قوت اور پلے ہوئے گھوڑے جو تم سے ہو سکیں مہیا کرو جس سے تم اللہ تعالیٰ کے اور اپنے دشمن کو اور ان کے سوا دوسرے لوگوں کو جن کو تم نہیں جانتے مرعوب کرو۔

قرآن کریم نے یہاں اس زمانے کے مروجہ ہتھیاروں کا ذکر نہیں کیا بلکہ قوت کا لفظ استعمال کر کے اس بات کی طرف اشارہ کر دیا کہ یہ قوت ہر زمانے اور ہر قوم اور ہر مقام کے اعتبار سے مختلف ہو سکتی ہے۔ اس زمانے میں تیر، تلوار اور نیزے تھے۔ پھر بندوق و توپ کا زمانہ آیا اس کے بعد بموں راکٹوں اور اب جنگی طیاروں، میزائلوں اور ایٹمی و کیمیاوی اور جراثیمی ہتھیاروں کا دور ہے۔ لفظ قوت میں یہ سب شامل ہیں۔ اس لئے آج کے مسلمانوں کو بقدر استطاعت تمام جدید ہتھیار حاصل کرنے چاہئیں اور ان کے لئے جن علوم و فنون کو سیکھنے کی ضرورت پڑے وہ سب اگر اس نیت سے سیکھے جائیں کہ ان کے ذریعے اسلام اور مسلمانوں کا دفاع اور کفار کا مقابلہ کیا جائے گا تو ان علوم و فنون کا حصول بھی جہاد کے حکم

(۱) انفال آیت ۶۰

میں ہے۔صحیح احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سامان جنگ فراہم کرنے اوراس کے استعمال کی مشق کرنے کو بڑی عبادت اور موجب ثواب عظیم قرار دیا ہے(۱)

## ۷۔خارجہ امور:

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰۤى اَوْلِيَآءَ ۘ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ؕ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ (۲)

اے ایمان والو!یہود ونصاریٰ کو دوست نہ بناؤ۔وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں اور تم میں سے جو کوئی ان کو دوست بنائے گا بیشک وہ انہی میں سے ہوگا۔بلاشبہ اللہ تعالیٰ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو یہود ونصاریٰ سے دوستی اور دوستوں جیسی معاشرت رکھنے سے منع فرمایا ہے کیونکہ باہمی اختلافات کے باوجود کافر ایک دوسرے کے دوست ہیں اور مسلمانوں کی مخالفت اور ضرر رسانی پر تمام کافر متفق ومتحد ہیں،مسلمانوں میں سے جو شخص ان سے دوستی رکھے گا حقیقت میں وہ انہی میں سے ہوگا۔

دوسرے جگہ ارشاد ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَكُمْ هُزُوًا وَّلَعِبًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ اَوْلِيَآءَ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ (۳)

اے ایمان والو!جن لوگوں نے تمہارے دین کو ہنسی اور کھیل تماشا بنا رکھا ہے اور جن کو تم سے پہلے کتاب مل چکی ہے تم ان کو اور کافروں کو اپنا دوست مت بناؤ اور اللہ سے ڈرتے رہو اگر تم مومن ہو۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو غیر مسلموں کی محبت اور دوستی سے نفرت دلائی ہے کہ کیا تم ان سے محبت اور دوستی کروگے جو تمہارے دین کو ہنسی اور مذاق میں اڑاتے ہیں،خواہ وہ لوگ اہل کتاب ہوں جیسے یہود ونصاریٰ یا دوسرے کافر ہوں۔اگر تم ان سے دوستی کروگے تو اندیشہ ہے کہ کہیں اس سے تمہارا

(۱)معارف القرآن/ج۴/۲۷۲،۲۷۳ (۲)المائدہ ۵۱ (۳)المائدہ ۵۷

ایمان واسلام نہ ضائع ہو جائے۔ پس تم اپنے دین کی عزت و حرمت کی پوری حفاظت کرو، اور دشمنان دین کے ساتھ محبت و دوستی نہ رکھو اس لئے کہ ان کی محبت و دوستی سے دین محفوظ نہیں رہ سکتا۔ البتہ ان کے ساتھ برابری کی سطح پر حالات کے مطابق معاہدے کرنے کی اجازت ہے۔

مذکورہ بالا آیات کی روشنی میں اسلامی ریاست کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی خارجہ پالیسی قرآنی تعلیمات اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احکامات وہدایات کی روشنی میں مرتب کرے، مدینہ منورہ میں اسلامی ریاست کے قیام کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے مدینے کے قرب وجوار میں آباد قبائل سے معاہدے کر کے ان سے حلیفانہ تعلقات قائم کئے۔ بہت سے قبائل نے اسلام قبول نہ کرنے کے باوجود مدینہ منورہ پر حملے کی صورت میں مسلمانوں کی مدد وحمایت کی ذمہ داری قبول کی۔ جن قبائل سے معاہدے کئے گئے ان میں جہینہ اور اس کی ذیلی شاخیں، بنی زرعہ اور بنی ربعہ، بنی ضمرہ، بنی جرمز، عوسجہ بن حرملہ، بنو غفار، اور بنو حمزہ وغیرہ شامل تھے۔ ان معاہدوں کے نتیجے میں نہ صرف یہ کہ مسلمان مضبوط ہو گئے بلکہ اس سے مشرکین مکہ بھی سیاسی طور پر کمزور ہو گئے۔ ہمارے حکمرانوں کو بھی سب سے پہلے اپنے ان پڑوسی ممالک کے ساتھ برابری کی بنیاد پر اچھے تعلقات استوار کرنے چاہئیں جن کے ساتھ ریاست کی سرحدیں ملتی ہیں، تا کہ پڑوسی ممالک کی طرف سے امن واطمینان حاصل ہو جانے کے بعد اپنے داخلی اور دیگر معاملات پر بھرپور توجہ دی جا سکے۔

اگر کوئی فریق معاہدے کی خلاف ورزی کرے تو قرآن حکیم معاہدے کی علانیہ تنسیخ کا حکم دیتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ ۝ (۱)

اور اگر کسی قوم کی طرف سے خیانت کا خوف ہو تو ان کا عہد ان کی طرف پھینک دیجئے تا کہ آپ اور وہ برابر ہو جائیں بیشک اللہ دغابازوں کو پسند نہیں کرتا۔

اگر فریق ثانی اپنے رویے پر پشیمان ہو اور صلح پر تیار ہو جائے تو پھر مسلمانوں کے لئے بھی خونریزی جاری رکھنا جائز نہیں بلکہ ان کی صلح کی پیشکش قبول کر لینی چاہئے۔ جیسا کہ ارشاد ہے۔

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ (۲)

اور اگر وہ کافر صلح کے لئے جھکیں تو آپ بھی جھک جایئے اور اللہ پر بھروسہ رکھیئے۔

اسلام امن وصلح جوئی کا مذہب ہے۔ اگر کوئی گروہ یا حکومت امن کی زبان نہ سمجھے اور محاذ

---

(۱) انفال ۵۸ (۲) انفال ۶۱

آرائی، قتل وقتال اور سازشوں پر آمادہ رہے تو ان کے خلاف سخت کاروائی کر کے امن وسلامتی کو یقینی بنایا جائے جیسا کہ ارشاد ہے۔

وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ط فَاِنِ انْتَهَوْا
فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ٥ (١)

اور کافروں سے قتال کرو یہاں تک کہ فتنہ (فساد) ختم ہو جائے اور دین سارے کا سارا اللہ کے لئے ہو جائے۔

دوسری جگہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا۔

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللّٰهَ وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ ط اِنَّ اللّٰهَ كَانَ
عَلِيْمًا حَكِيْمًا٥ (٢)

اے نبی (ﷺ)! آپ اللہ سے ڈرتے رہئے اور کافروں اور منافقوں کے کہنے پر نہ چلئے۔ بیشک اللہ جاننے والا اور حکمت والا ہے۔

وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَدَعْ اَذٰهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ط
وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا٥ (٣)

اور آپ کافروں اور منافقوں کا کہنا نہ مانئے اور نہ ان کے تکلیف دینے پر نظر کیجئے اور آپ تو اللہ ہی پر بھروسہ رکھیے۔ اور اللہ ہی کافی کارساز ہے۔

پس اپنے خارجی معاملات میں اس خوف سے دشمن کا کہا ماننا کہ اگر ایسا نہ کیا تو وہ تکلیف پہنچائے گا، قرآنی تعلیمات کے خلاف ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تُطِيْعُوا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَرُدُّوْكُمْ عَلٰۤى
اَعْقَابِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ٥ (٤)

اے ایمان والو! اگر تم کافروں کا کہا مان لو گے تو وہ تمہیں الٹے پاؤں پھر دیں گے۔ پھر تم خسارے میں پڑ جاؤ گے۔

آج دنیا بھر کے مسلمان ملکوں کا حال یہ ہے کہ وہ کافروں کی اطاعت گزاری میں ایک دوسرے پر سبقت لیجانے کی دوڑ میں لگے ہوئے ہیں اور ان پر اندھا اعتماد کئے ہوئے ہیں، حتی کہ انہوں نے اپنے سرمائے کا ایک بہت بڑا حصہ بھی انہی کافر ملکوں میں لگا رکھا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اپنے دفاعی،

(١) البقرہ آیت ۱۹۳ (٢) الاحزاب آیت ۱ (٣) الاحزاب آیت ۴۸ (٤) آل عمران ۱۴۹

اقتصادی، فنی اور سیاسی وحکومتی معاملات وغیرہ کے لئے مشیر اور ماہرین بھی انہی ملکوں سے بلائے جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمان ملک دفاعی، اقتصادی اور سائنسی معاملات میں نہایت پسماندہ ہیں اور آپس میں ایک دوسرے کے دشمن بنے ہوئے ہیں۔ کفار اپنی اس حکمت عملی میں پوری طرح کامیاب ہیں کہ مسلمانوں کو باہم لڑا کر اس قدر کمزور کر دیا جائے کہ وہ سر اٹھانے کے قابل نہ رہیں۔ یہ مسلمانوں کے لئے لمحۂ فکریہ ہے۔ ان کو اس پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہئے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے۔

وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ (۱)

اور تم ان کے خلاف اللہ کی راہ میں قتال کرو جو تمہارے خلاف قتال کرتے ہیں۔

پس مسلمان دنیا کے کسی خطے میں بھی ہوں جب ان پر کافروں کی طرف سے حملہ ہوتا ہے تو تمام عالم اسلام پر بتدریج جہاد فرض ہو جاتا ہے۔ اس لئے تمام مسلم ممالک کو چاہئے کہ کافروں کے خلاف وہ بھی اسی طرح متحد و متفق ہو جائیں جس طرح کفار اسلام دشمنی پر آپس میں متفق و متحد ہیں۔ تمام مسلم ممالک کو اپنی خارجہ پالیسی میں یہ بات واضح طور پر شامل کرنی چاہئے کہ اگر کسی غیر مسلم ملک نے کسی مسلم ملک پر حملہ کیا تو یہ حملہ تمام اسلامی ممالک کے خلاف متصور ہوگا۔ اسی صورت میں مسلم ممالک غیر مسلم حملہ آوروں سے محفوظ ہو سکتے ہیں۔ بصورت دیگر مسلم ملکوں کے عدم اتحاد کے نتیجے میں مسلم ملک ایک ایک کر کے غیر مسلموں کے حملوں کا شکار ہو کر ختم ہوتے رہیں گے۔

مسلمانوں کو یہ بات خوب سمجھ لینی چاہئے کہ وہ دشمن سے اسلحہ خرید خرید کر کبھی طاقتور نہیں ہو سکتے۔ اس لئے ان کو چاہئے کہ وہ اپنے وسائل کو مجتمع کر کے امداد باہمی کے اصول پر مختلف اسلامی ملکوں میں اسلحہ سازی کے کارخانے قائم کریں اور ان کو فروغ دیں اور ان سے پوری طرح استفادہ کریں اور کافروں پر اعتماد کرنے کی بجائے ایک دوسرے پر بھروسہ کریں۔ نیز اپنی معاشیات کو مضبوط کریں اور تمام مسلم ممالک تجارت، زراعت، صنعت، دفاع اور مواصلات میں ایک دوسرے کے ساتھ مشترکہ طور پر کام کریں۔ اور ایک دوسرے کے تجربہ اور معلومات سے استفادہ کریں۔ اور اپنی دولت مشترکہ بنائیں تاکہ وہ قرآن حکیم کے مطابق عملاً امت واحدہ بن جائیں۔ جیسا کہ ارشاد ہے۔

اِنَّ ھٰذِہٖٓ اُمَّتُکُمْ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً ۡ (۲)

تحقیق تمہاری یہ امت (حقیقت میں) ایک ہی امت ہے۔

---

(۱) البقرہ ۱۹۰ (۲) الانبیاء ۹۲